R No 2186/A I.

Regd. No.A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

[illegible]

Telephone No. 20

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۰ - شمارہ ۱۸ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۸ مئی سنہ ۱۹۶۱ء

ابو محمد سحر

امیر مینائی کے غیر مطبوعہ قصیدے کا ایک خاص قلمی نسخہ

امیر مینائی کے ایک اردو قصیدے کا نہایت خاص قلمی نسخہ میری نظر سے گذرا ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے قصیدہ بھی غیر مطبوعہ ہے اس لئے مختصر تعارف کے ساتھ اسے "ہماری زبان" کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

یہ قصیدہ والیٔ بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم کی مدح میں ہے اور عید اضحیٰ کی تہنیت میں لکھا گیا ہے۔ نسخہ تین اوراق پر مشتمل ہے جن کا سائز (۸" × ۱۲ ۱/۲") ہے۔ کاغذ سفید اور دبیز امپیریل مارکہ کا ہے۔ تینوں اوراق الگ الگ ہیں۔ جلد کے آثار صرف سلائی کے نشانات کی صورت میں رہ گئے ہیں۔ نیچے سے تینوں اوراق کا کچھ حصہ کرم خوردہ ہے جس کی زد میں کچھ اشعار کے بعض الفاظ بھی آگئے ہیں لیکن اشعار بخوبی صحیح پڑھ لئے جاتے ہیں۔ قصیدہ دوسرے صفحہ سے پانچویں صفحے کے وسط تک پھیلا ہوا ہے۔ پہلا اور آخری صفحہ بالکل سادہ ہے متن کا ناپ ۱/۲ ۵" × ۸" ہے۔ آغاز ایک دیدہ زیب لوح کے تحت ہوا ہے جو وسط سے اوپر تک چلی گئی ہے اور جس کے نقش و نگار اور خطوط میں سُرخ، نیلے، سُنہرے اور سبز رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ جدول میں نیلا، سُنہرا اور سبز رنگ کام میں لایا گیا ہے۔ شیرازہ کی جانب کو چھوڑ کر صفحات کے تینوں کناروں کے قریب بیرونی حاشیے کے طور پر نیلا خط پڑا ہوا ہے۔ جدولیں شیرازے کی طرف سرے سے آدھ انچ کے فاصلے پر کھینچی گئی ہیں جس کی وجہ سے دوسری طرف کا حاشیہ زیادہ چوڑا ہے۔ اوپر اور نیچے کے حاشیے برابر ہیں۔ لوح کا زیریں حاشیہ تین برابر حصّوں میں منقسم ہے۔ بیچ کے حصّے میں خط نستعلیق میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا ہوا ہے جس کے گرد حلقہ دار خط کھینچ کر سُنہرا رنگ بھرا گیا ہے۔ اس کے بعد الگ جدول میں دو سطروں میں عنوان درج ہے۔ بین السطور اور اطراف حلقہ دار خطوں میں طلائی ہیں۔ اسی طرح گریز کے بعد مدح کا پہلا شعر جس میں نواب شاہ جہاں بیگم کا نام آیا ہے، عرض مطلب کے تین اشعار اور خاتمہ کی عبارت علیحدہ جدولوں میں آراستہ کئے گئے ہیں۔

عنوان اور خاتمہ کی عبارت خط نسخ میں ہیں اور اشعار نستعلیق میں۔ روشنائی ہر جگہ سیاہ ہے۔ کتابت میں غیر معمولی اہتمام سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ خاص ممدوحہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ نسخہ پر کاتب کا نام یا تاریخ کتابت وغیرہ درج نہیں ہے۔

امیر کے قصیدے کا یہ نسخہ ایک عرصے سے جناب محمد اسمٰعیل صاحب مالک کتب خانہ موسوم بہ "کتاب گھر" بھوپال کی ملکیت ہے۔ موصوف کا بیان ہے کہ انھیں یہ نسخہ منشی منصب علی خاں کے ورثا سے ملا تھا۔ منشی منصب علی خاں نواب شاہجہاں بیگم کی جانشین نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانے میں ممتاز اراکین ریاست میں تھے۔

امیر مینائی دو مرتبہ بھوپال آئے تھے۔ ایک مرتبہ ۱۸۹۰ء میں اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۰۰ء میں۔ دونوں مرتبہ حیدرآباد جانے کا قصد تھا۔ پہلی بار یہ ارادہ پورا نہ ہوا اور بھوپال سے ہی واپس چلے گئے۔ دوسری بار ارادہ پورا ہوا لیکن حیدرآباد پہنچتے ہی موت نے آگھیرا۔ پہلی بار بھوپال میں امیر کی آمد عید اضحیٰ کے قریب ہوئی تھی۔ دوران قیام میں بقول ممتاز علی آہ دوسری منظومات کے علاوہ عید اضحیٰ کے آنے پر امیر نے ایک رباعی نواب شاہ جہاں بیگم کے حضور میں گزاری تھی۔ زیر بحث قصیدے کا

تعلق بھی عید اضحیٰ سے ہے۔ قیاس آرائی سے کام لیا جائے تو یہ فیصلہ کردینا بہت آسان ہے کہ امیرؔ نے یہ قصیدہ اسی زمانے میں پیش کیا ہوگا، لیکن اس سلسلے میں ضروری ماخذ پر نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ امیرؔ کے سفر بھوپال کا نتیجہ نہیں بلکہ سفر بھوپال خود اس قصیدے یا اسی قسم کی اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔ امتیاز احمد خاں رازؔ کو رام پور سے یکم جون ۱۸۹۹ء کے خط مطبوعہ مکاتیب امیر مینائی میں امیرؔ لکھتے ہیں :-

"تعجب ہے کہ سرکار عالیہ نے گذارش کی عبارت بغور ملاحظہ فرمائی اور پھر کچھ نہ فرمایا، تہنیت عید اضحیٰ میں ایک قصیدہ جناب وزیر صاحب کے توسط سے میں نے پھر بھیجا ہے۔ اسکے پہنچنے اور پیش ہونے کا کچھ حال اب تک معلوم نہیں ہوا۔ اگر تم صحیح ہو تو کھوج نکالئے۔ اللہ کرے تمہاری طبیعت اب بالکل اچھی ہو۔"

اس طرح یہ بات صاف ہے کہ یہ قصیدہ امیرؔ نے ممدوحہ کو بھوپال کے دوران قیام میں نہیں پیش کیا تھا بلکہ اس سے کم و بیش ایک سال پہلے رام پور سے ان کے لئے "جناب وزیر صاحب" کے توسط سے بھیجا تھا۔ بھوپال میں اس وقت وزیر ریاست منشی امتیاز علی خاں تھے جو تزک سلطانی مولفہ نواب سلطان جہاں بیگم کے مطابق قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے باشندے تھے۔ ان کا انتقال جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ (نومبر ۱۸۹۶ء) میں ہوا۔ کاکوری اور لکھنؤ سے تعلق کی بنا پر غالباً اس وقت تک دربار بھوپال میں یہی امیرؔ کا سب سے اہم وسیلہ تھا اپریل یا مئی ۱۸۹۱ء میں جب امیرؔ بھوپال پہنچے تو خان بہادر مولوی عبدالجبار عہدۂ وزارت پر فائز تھے۔ آپ کا بیان ہے کہ دوران قیام بھوپال میں باغ فرحت افزا میں جہاں امیرؔ سرکاری مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے نواب شاہ جہاں بیگم کی طرف سے وزیر ریاست مولوی عبدالجبار ملاقات اور پرسش احوال کے لئے آتے تھے۔

قصیدے کے ممدوحہ تک پہنچنے کے بارے میں نہ تو نسخے میں کوئی اندراج ہے اور نہ کسی اور قول سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن امیرؔ کی ایک تحریر سے بالواسطہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممدوحہ تک پہنچا تھا۔ جلالؔ لکھنوی کو ۸ دسمبر ۱۸۹۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میرے چار قصیدے جو میں نے نواب عالمگیر محمد خاں کے ذریعہ سے پیش کرنے کے لئے بھیجے تھے آخر میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک سرکار عالیہ تک پہنچا اور تین کا پتہ نہیں کہ کیا ہوئے۔"

اگر "جناب وزیر صاحب" کے توسط سے بھیجا ہوا یہ قصیدہ نہ پہنچا ہوتا تو اس عبارت میں کسی عنوان سے اس کا ذکر بھی ضرور آتا۔

اس قصیدے میں ادبی اعتبار سے اس کے سوا کوئی اور خوبی نہیں ہے کہ یہ امیرؔ جیسے کہنہ مشق شاعر کے قلم سے نکلا ہے تشبیب بہت مختصر ہے۔ دوسری فنی نزاکتوں کا بھی پوری طرح خیال نہیں رکھا گیا ہے مثلاً کئی شعروں میں تواتر ردیف کا عیب ہے۔ ایک شعر کا مضمون اس اعتبار سے محل نظر ہے کہ قصیدہ ایک خاتون کی شان میں ہے۔

اشارہ تیری چشم لطف کا خالی نہیں جاتا
نظر ڈالی ہے جس پر آرزو اس کی نکالی ہے

تاہم کہیں کہیں قصیدہ کا مخصوص رنگ موجود ہے۔ مثلاً

گدا ہے جو یہاں وہ بھی ہے مست جام استغنا
جہاں کی نعمتوں سے دل بھرا ہے ہاتھ خالی ہے

امیرؔ اپنی عمر کے آخری ایام میں امراض جسمانی اور طرح طرح کی دوسری کاوشوں میں مبتلا تھے۔ شاعری سے انھیں نفرت ہوگئی تھی۔ امیر اللغات کی تکمیل کے لئے سرمایہ کا انتظام نہ ہونے کے علاوہ ذاتی اخراجات کی کفالت بھی دشوار ہورہی تھی اور وہ بہت سراسیمہ اور گھبرائے ہوئے تھے۔ ان حالات میں فوری مقصد براری کے لئے مدحیہ منظومات کا سر انجام کرنا ایک اضطراری فعل سے زیادہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قصیدے اور امیرؔ کے مطبوعہ قصیدوں میں نمایاں فرق ہے۔ یہ قصیدہ سوانحی اعتبار سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس سے دربار بھوپال میں امیر مینائی کی سلسلہ جنبانیوں پر روشنی پڑتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب مع عنوان اور خاتمے کی عبارت کے قصیدہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"قصیدۂ تہنیت عید اضحیٰ بحضور قدرداں قیصر شان نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کرون آف انڈیا رئیس دلاور اعظم طبقۂ اعلیٰ ستارۂ ہند رئیسہ بھوپال دام ملکہا و اقبالہا"

عروس عید کے قربان کیا رنگت نکالی ہے
ہنسی ہونٹوں پہ سرخی گال پر منھ پر بحالی ہے
گلوں کا رنگ اڑاتی ہے اداسی مسکراتی ہے
رنگیلی ہے رسیلی ہے انوکھی ہے نرالی ہے
حیا بھی چشم بد دور آئی کس شوخی کے پردے میں
شفق سے لے کے چہرے پر نقاب سرخ ڈالی ہے
بھبھوکا ہو رہا ہے ڈوب کر رنگ مسرت میں
حنا کا ہے کو ہے یہ خون قربانی کی لالی ہے
وہ جھک جھک کر گلے ملنا ذبیحوں پر چھری چلنا
ادھر شان جمالی ہے ادھر شان جلالی ہے
کیا ہے خون پھولوں کا رنگا ہے لال گوں جوڑا
چمن سے بن کے نکلی ہے وطن کو جانے والی ہے
چمن اقبال ہے اس کا وطن بھوپال ہے اس کا
وہی بھوپال جس کا ایک با اقبال والی ہے
وہ با اقبال کون انجم خدم شاہ جہاں بیگم
خدا رکھے خدائی میں یہی اک ذات عالی ہے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

ہماری زبان

۸ مئی ۱۹۶۱ء

ماہرین کو موقع دیجئے

اُردو تحریک کے سلسلے میں ہمیں اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ ہم بعض مخصوص مسائل پر اُن لوگوں کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے، جنھیں ان چیزوں کا ذاتی تجربہ ہے اور جو اس سلسلے میں برسوں سوچ بچار کر چکے ہیں۔ ہم عام طور پر تبدیلی کے خلاف ہیں۔ "طرزِ نو" سے ڈرتے ہیں اور "طرزِ کہن" پہ اڑتے ہیں۔ اس لئے ہماری بڑی تعداد اسی ڈھرے کو کافی سمجھتی ہے جو برسوں سے چل رہا ہے۔ وہ بدلتے ہوئے حالات کا مطالعہ نہیں کرتی، وہ نئی ضروریات کو نہیں دیکھتی۔ وہ تو ذرا سی تبدیلی کو شکست کے مترادف سمجھ لیتی ہے، اشخاص کے یہاں وضعداری اچھی ہو تو ہو، قوموں میں وضعداری کو سراہا نہیں جا سکتا۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے ملک میں انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ہم بڑی تیزی سے صنعتی نظامِ زندگی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس صنعتی نظام میں ہم اپنی تہذیبی قدروں کو مناسب ردّ و بدل کے ساتھ باقی رکھ سکتے ہیں، لیکن اگر ہم نے تہذیب کے ایک مطلق اور جامد تصور کو اپنایا تو صنعتی نظام تو اپنا اثر دکھا کر رہے گا، ہماری تہذیبی قدروں کی صرف پرچھائیں رہ جائے گی۔

مثلاً ہم نستعلیق حروف کو چھپائی میں اب بھی عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ ابھی ہماری خواندہ برادری کا بڑا طبقہ صحیح معنی میں تعلیم یافتہ اور مہذب نہیں ہے، اس لئے وہ قوسوں اور دائروں کا اسیر ہے اور ٹائپ کے حروف کو، جن میں صحت کا زیادہ التزام ہو سکتا ہے اور کتابیں زیادہ تعداد میں چھپ سکتی ہیں اور بالآخر سستی بک سکتی ہیں، پسند نہیں کرتا۔ اُسے یہ فکر نہیں کہ بچوں، بالغوں اور بیرونی ممالک کے طلبہ کے لئے حروف کی شکلوں میں کم سے کم تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ حروفِ تہجی کی ترتیب صوتی اعتبار سے ہونی چاہئے۔ املا کو آسان بنانا چاہئے۔ اخبار اس طرح چھپنے چاہئیں کہ چند گھنٹوں میں سب مرحلے طے ہو جائیں اور بہت سے کاتب نہ رکھنا پڑیں۔ اخباروں اور رسالوں میں تصویروں کا معیار بلند ہونا چاہئے۔ ٹائپ رائٹر میں کم سے کم جوڑ رکھنا چاہئیں، اوقاف کا التزام کرنا چاہئے۔ اصطلاحوں کے معاملے میں مزاج سے بچنا چاہئے۔ جمع اُردو کے قاعدے سے زیادہ بنانا چاہئے۔ اگر کبھی کبھار ہندی اور فارسی الفاظ اضافت کے ساتھ آجائیں تو اس معاملے میں قدما کی سی رواداری برتنی چاہئے۔ الفاظ کا بھی مزاج ہوتا ہے۔ ہم زبان اور ادب میں تسلسل اور معیار کے قائل ہوتے ہوئے، اپنے دور کے مزاج کی بہتر آئینہ داری تو کر ہی سکتے ہیں۔ ہم بچوں کے لئے کتابوں میں ماہرین تعلیم اور لسانیات کے طالب علموں کے تجربات سے تو کام لے سکتے ہیں۔ ہم چھپائی کے سلسلے میں اخبار نویسوں، ناشروں اور پریس کے کارکنوں کی بصیرت سے تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم جلد بندی کا معیار تو بلند کر سکتے ہیں۔ ہم کتابوں کی نکاسی کے متعلق پڑھنے والوں کی دلچسپیوں کے اعداد و شمار جمع کر کے قیاس کے گھوڑے دوڑانے کے بجائے ٹھوس باتیں تو کہہ سکتے ہیں۔ ہم فلم اور ریڈیو کی زبان کے عام فہم حصے سے تجربے میں کام تو لے سکتے ہیں۔ ہم دوسری ہندوستانی زبانوں کے شاہکاروں سے اردو واقفیت پیدا کر کے ایک جذباتی ہم آہنگی میں مدد تو دے سکتے ہیں۔ ہم کتابوں کی نکاسی کم ہونے کا ماتم کرنے کے بجائے، خاص خاص موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے کلب تو قائم کر سکتے ہیں۔ ہم معجون مرکب رسالوں کے بجائے، مخصوص پہلوؤں پر رسالے تو نکال سکتے ہیں۔ ہم اپنے اخباروں میں پڑھنے والوں کی دلچسپی کا دائرہ وسیع تو کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں انگریزی کے اخباروں کے خاص خاص فیچروں کے طرز پر اپنے یہاں عنوان قائم تو کر سکتے ہیں۔

پہلی ضرورت بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے کی ہے، دوسری ضرورت ان حالات کے ماہرین کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی ہے، تیسری ضرورت اس فائدے کو موجودہ دور کی تیز رفتار رنگا رنگ اور اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھنے والی آبادی کے لئے ناگزیر ثابت کرنے کی ہے۔ آج صرف شاندار ماضی کافی نہیں، اسے حال کی اشد ضرورت ہونا چاہئے۔ اُردو ایسی ضرورت ثابت کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اُردو دوستوں کے ذہنوں میں اور لچک ہو اور وہ مسائل کو قومی اہمیت اور افراد کی سہولت کے تحت دیکھنا سیکھ لیں۔ بچوں کیلئے کتابیں لکھنے والا ادیب چاہے نہ ہو مگر معلم ضرور ہو۔ اخبار جذبات سے کم کھیلیں، معلومات زیادہ عطا کریں، بچوں کو اُردو لکھنے پڑھنے میں دوسری زبانوں کے لکھنے پڑھنے سے زیادہ وقت نہ لگے۔ اُردو کی کتابیں ہر پریس میں چھپ سکیں۔ اُردو کا شاعر خلا میں پرواز پر نظم لکھے یا نہ لکھے مگر خلا میں پرواز کے دور کی نفسیات اور ذہن کو جذب کر سکے اور اس ذہن کی ترجمانی مناسب اور موزوں الفاظ میں کر سکے۔ کچھ لوگوں کو ان باتوں کا احساس ضرور ہے، مگر یہ کافی نہیں۔ اس احساس کو جلد سے جلد عمل میں ظاہر ہونا چاہئے۔ آج صدیاں سمٹ کر لمحات بن رہی ہیں۔ اگر ہم نے اور غفلت برتی، اور اپنے کو 'خلاصۂ کائنات'، یا 'شہیدِ انقلاب' ہی سمجھتے رہے تو کہیں کے نہ رہیں گے۔ اس لئے ماہرین کو طاق میں بٹھا کر خوش ہو لینے کے بجائے، ان کی قیادت میں اپنے کارواں کو آگے بڑھانے کی سعی فوراً شروع کر دینی چاہئے۔

اِدھر اُدھر سے

جشنِ ٹیگور

پنڈت نہرو اور صدر کنیڈی کے پیامات

نیویارک ۱۷ اپریل کی رات یہاں ٹاؤن ہال میں ٹیگور کو خراج تحسین دینے کے لئے ایک خصوصی پروگرام منعقد ہوا جس کے لئے امریکی صدر جان ایف کنیڈی اور ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے پیغامات بھیجے گئے۔

وزیر اعظم نہرو نے اپنے پیغام میں کہا "مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے کہ ایشیا سوسائٹی رابندر ناتھ ٹیگور کو خراج عقیدت ادا کر رہی ہے۔ میں اس موقع پر اپنی نیک خواہشات اور مبارک باد بھیجتا ہوں، دوسرے ملکوں میں ٹیگور کا ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم انسان دوست کے طور پر احترام کیا جاتا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے دنیا کے ایک بڑے انسان تھے، اور آج دنیا جیسی ہے وہ اس کے ایک عظیم معمار تھے، میری نسل کے لوگوں پر ان کا اثر اس قدر چھایا ہوا ہے کہ اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا اور کہا وہ آج کی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔"

صدر کنیڈی نے اپنے پیغام میں کہا کہ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کے جشن صد سالہ سالگرہ کے موقع پر مختلف کمیٹیاں امریکہ اور دنیا بھر میں ٹیگور کے ناٹک تحریریں اور کتابیں پیش کر رہی ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کو، اور جس ملک نے انھیں جنم دیا ہے اسے امریکیوں کی طرف سے خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے رابرٹ فراسٹ کا انتخاب خصوصاً بہت اچھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خراج عقیدت اثر پذیر اور قابل قدر ہوگا۔"

تقریبات تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ

حکومت مہاراشٹر نے ۱۹۶۱ء میں ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلے میں جو تقریبات ہوں گی انھیں تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

الکشن کی فہرست اُردو میں

لکھنؤ۔ آئندہ عام انتخابات کے لئے فہرستیں اب پہلی مرتبہ اُردو میں بھی تیار کی جائیں گی۔ ریاستی الکشن آفس کو الکشن کمیشن نے ہدایت کی ہے کہ وہ چھ ضلعوں اور ایک شہر کے لئے اُردو میں بھی فہرستیں تیار کرے۔ یہ اضلاع مندرجہ ذیل ہیں:۔

رام پور، بریلی، بجنور، مراد آباد، سہارن پور، مظفر نگر، اور لکھنؤ۔

غالب کا صد سالہ یوم وفات

۱۹۶۹ء میں ہندوستان بھر میں اُردو کے مشہور شاعر غالب کا صد سالہ یوم وفات منایا جائے گا۔ اس کا انکشاف حیدرآباد میں حکومت ہند کے وزیر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے جو کمیٹی بنائی جائے گی غالباً اس کے صدر نواب رامپور ہوں گے۔ رامپور کا حکمراں خاندان غالب سے قریب کا تعلق رکھتا ہے۔

دہلی میں غالب کا رہائشی مکان حکومت حاصل کرے گی اور اسے ایک قومی یادگار کے طور پر محفوظ رکھے گی۔

ساہتیہ اکیڈمی غالب کی غزلوں کے تراجم ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کرنا چاہتی ہے امید ہے کہ وہ جلدی ہی یہ کام شروع کر دے گی۔ جب غالب کا یوم وفات منایا جائے گا تو ڈاک کے ٹکٹوں پر ان کی تصویر چھاپی جائے گی۔ صد سالہ تقریب میں ایران اور پاکستان کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔ کیونکہ ان دونوں ملکوں میں غالب کو قبول عام کا درجہ حاصل ہے۔ غالب کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں بمقام دہلی ہوا تھا۔

مہاراشٹر اُردو بک سیلرز اوارڈ

مہاراشٹر کے اُردو ناشروں اور تاجران کتب نے اپنے اپنے مصنفوں کی قدر افزائی میں پہل کرتے ہوئے ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالی ہے جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے۔ یہ ادارہ ہر سال اُردو شاعروں اور ادیبوں کو ان کی تخلیقی خدمات پر انعامات دے گا۔

اس سال کے انعامات کے لئے صفیہ اختر مرحومہ کے مجموعہ مضامین "انداز نظر" اور ڈاکٹر صفدر آہ کی کتاب "فردوسی ہند" کو انعام کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

اس اوارڈ کمیٹی کے سکریٹری شاہد علی خاں ہیں۔

(روزنامہ "ہندوستان" بمبئی)

بیلٹ پیپر مادری زبان میں

نئی دہلی ۲۶ اپریل کو نائب وزیر قانون کے لوک سبھا میں یہ کہنے پر کہ ہر زبان میں بیلٹ پیپر فراہم کرنا ممکن نہیں ہے ممبران نے سخت نکتہ چینی کی ہے۔

شری مہابیر تیاگی نے کہا کہ بیلٹ پیپر کس زبان میں ہوں یہ بہت زیادہ اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ بیلٹ پیپر ووٹروں کی مادری زبان میں ہونے چاہییں۔

اس پر وزیر اعظم نہرو نے کہا کہ شری تیاگی کی تجویز اس قدر صحیح ہے کہ اسے بغیر کسی غور و خوض کے تسلیم کر لیا جانا چاہیے۔

عزیز قیسانی

پرواز

(دسا نیٹ۔ دنیا کے پہلے خلاباز کی زبانی)

دور پہنائی آفاق میں محوِ پرواز
دیکھتا کیا ہوں کہ اک پیکر حسن سیّاد
تہِ افلاک سیہ پوشش تجلّی بکنار
نیلی چادر میں چھپائے ہوئے اک دفترِ راز
گھومتا جاتا ہے، راتوں کی حسیں چھاؤں تلے
گردشِ رقص میں ہو جیسے کوئی زہرہ جمال
یا حجاباتِ تغیّر میں عروسِ مہ و سال
جیسے تقدیر کے دامن میں مسلسل ناچے

دیکھتا کیا ہوں کہ رقاصۂ گیتی کے بغیر
آتشِ سینۂ ہستی میں کمی پاتا ہوں
یعنی پہلو میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں
راس آئی نہ معاماتِ تہِ عرش کی سیر
چیر کر سینۂ افلاک کو واپس آیا
تجھ کو پایا مری دلدار تو سب کچھ پایا

یٰسین علی خاں

خلاؤں کے فاتح

خلاؤں کے فاتح میں کیا تجھ سے پوچھوں
مرا علم کتنا۔ مری بات کتنی
سحر کے نقیبو۔ مگر یہ بتاؤ
رہی کتنی باقی۔ کٹی رات کتنی

قیصر شمیم

جیون پتھ پر

اونچے نیچے، ٹیڑھے میڑھے
گھور اندھیرے جیون پتھ پر
ننھی منّی آشاؤں کے
جلتے بجھتے دیپ لئے میں
جانے کب سے بھٹک رہا ہوں!

اپنے پرائے، سنگی ساتھی
(اونچے نیچے، ٹیڑھے میڑھے
گھور اندھیرے جیون پتھ پر!)
اک اک کر کے بچھڑ گئے ہیں!!

آج اکیلے اندھیارے میں
ننھی منّی آشاؤں کے
جلتے بجھتے دیپ لئے میں
اپنی منزل ڈھونڈ رہا ہوں!

خلیل رامپوری

غزل

کھڑکیاں بند ملیں راستے سنسان ملے
اپنی آنکھوں کی طرح شہر بھی ویران ملے
آدمی ہیں کوئی بھٹکے ہوئے آہو تو نہیں
چاہتے ہیں کوئی مہتاب سا انسان ملے
ہائے کس ڈھنگ سے آیا ہے ترا آج خیال
جیسے بچھڑا ہوا برسوں کا کوئی آن ملے
ہم کسی مصلحتِ غیر کے پابند نہیں
جس کو ملنا ہے وہ ہم سے سرِ میدان ملے
آج دنیائے ادب کا ہے وہی چاند خلیل
جس کے افکار میں تخلیق کا وجدان ملے

مہر چند کوثر

غزل

اسیرِ غم کو خوشی کا پیام ہم نے دیا
شبِ سیاہ کو ماہِ تمام ہم نے دیا
کلی کلی کو سکھایا شعور کھلنے کا
نسیمِ صبح کو درسِ خرام ہم نے دیا
تجھے خبر بھی ہے ساقی کہ آبِ نگیں کو
حریفِ گردشِ دوراں کا نام ہم نے دیا
ہمیں سے زندہ رہیں عظمتیں محبت کی
سرورِ عشق کو کیفِ دوام ہم نے دیا
سپرد کر دی ترے ہاتھ میں عنانِ حیات
تری رضا کو مشیت کا نام ہم نے دیا
ترس رہی تھی تغزّل کو انجمن کوثر
ادب کے تشنہ لبوں کو یہ جام ہم نے دیا

رئیس فروغ

اپنے حصے میں مئے ناب ہی کتنی آئی
اب کے پی لیں تو تہی جام ہوئے جاتے ہیں
گھر میں آرام سے رہنے کے ہزاروں ارماں
صرفِ تعمیرِ در و بام ہوئے جاتے ہیں
میں نے سینے میں جو کچھ زخم چھپا رکھے تھے
چاکِ پیراہنِ ایام ہوئے جاتے ہیں

صلاح الدین نیّر

تمام عمر سہی تیرا غم گوارا ہے
ترا خیال مجھے زندگی سے پیارا ہے
جس اشک سے ترے دامن کی بڑھ گئی عظمت
وہ میری آنکھ کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے
کلی سے پھول تلک احسان ہے صبا کا مگر
گلوں کے حسن کو شبنم نے ہی نکھارا ہے
فریبِ محض سہی ربطِ ساحل و طوفاں
امید و بیم کی الجھن نے مجھ کو مارا ہے
نہ جانے کیوں مری رفتار ہو گئی مدھم
خیال پڑتا ہے تم نے مجھے پکارا ہے

اُردو کے اہم رسالے ۔ ۳۰

راشد الخیری کا رسالہ 'تمدن' دہلی

عابد رضا بیدار

شیخ محمد اکرام اور محمد عبدالراشد الخیری کی 'ایڈیٹری' میں ۲۰ صفحات پر مشتمل "معاشرتی، تمدنی، ادبی، فلسفی، اخلاقی، تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن" 'تمدن' کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۱۱ء میں باہتمام محمد عبدالراشد الخیری، تمدن پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا۔ یہ پہلا پرچہ اپنی ترتیب کے اعتبار سے پورے فائل کی معراج سمجھنا چاہیے۔

اس پرچے میں مولوی نذیر احمد کی آخری زمانے میں ایک اہم تحریر، اور اقبال کی غالباً سب سے پہلی اور غیر معروف، فارسی غزل کے علاوہ بھی جو کچھ ہے اس میں کوئی چیز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ تعدد ازدواج پر شیخ محمد اکرام کا طویل مضمون، احمد علی شوق قدوائی کا ایک توشیہ قطعہ، سید شوکت دہلوی کے مضمون "حیات بعد الممات" کی پہلی قسط، شمس العلماء میرزا کوثر کی غزل مستحسن زیدی، از کیمبرج، کی نظم "اسلام"۔ بھائی کا خط بہن کے نام کے عنوان سے سلطان حیدر جوش، علیگ کا پردے کی موافقت میں ایک طویل مضمون، نیرنگ کا ایک شعر، شاد عظیم آبادی کی نظم "حبیب ابن مظاہر"، "مسز اورس الیسٹ" کے عنوان سے کرانیکل سے ایک ترجمہ، نادر کاکوروی کی ایک رباعی، عزیز کی نظم "عصر جدید" اور قطعہ، محمد سیف الدین شتاب حیدرآبادی کی نظم "نغمۂ مسرت"، سید احمد دہلوی کا مضمون "بیزولنے کے مورخ"، راشد الخیری کا مختصر سا انشائیہ "ضمیر" اور آخری صفحے پر "گپ شپ" کے تحت دو لطیفے —— یہ ہیں پہلے پرچے کے مشمولات۔ اور ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تمدن میں کتنا تنوع تھا۔

"تمدن کے مقاصد میں اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کانوں تک پہنچانا ہے۔

تمدن ایک اکسٹرا لبرل پرچہ ہے جس میں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالیٹکس سے علیحدہ ہو اس وجہ سے ہرگز رد نہیں ہوسکتا کہ تمدن اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔"

"تمدن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہوں گے جو خواتین کے مطالعہ سے گزر سکیں۔"

مندرجہ بالا تین نکات تمدن کے مقاصد کے جلی عنوان تھے۔

ایڈیٹروں میں اکرام اس سے پہلے ہی مخزن میں عبدالقادر کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ راشد الخیری بھی عصمت کی وجہ سے اس میدان میں جانے پہچانے تھے۔ دونوں کی کوششوں سے ۱۹۱۶ء کے ستمبر تک تمدن بڑے اچھے طریقے سے نکلتا رہا۔ پہلی جلد کے جو مزید پرچے مجھے مل سکے ہیں ان میں سید جمال الدین افغانی پر سید شوکت دہلوی کا مضمون (۱:۲) قطعۂ تاریخ وفات امیر اللہ تسلیم، از ارشد تھانوی (۱:۳) محمدن یونیورسٹی از احمد علی شوق قدوائی (۱:۴) 'آزاد' سہارنپوری کی ایک غیر معروف نظم (۱:۴) اقبال کا "شکوہ" (۱:۴) اور ایک قطعہ، کل علامہ سے جو اقبال ترجمہ چھاپ ہیں نے ..... پابند نماز (۱:۵) نیاز کا ایک منظوم ترجمہ "وفا" (۱:۵) اور ذکاء اللہ کی تصویر کے ساتھ ان پر نذیر احمد کا مضمون قابل ذکر ہیں۔

نذیر احمد: اس دور کی مزید قابل ذکر تحریروں کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نذیر احمد کی دو تحریریں تمام و کمال پیش کردوں۔ پہلی، پہلے پرچے کے دیباچے کے طور پر "التقریب" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ یہ تحریر اب ایک نایاب تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور نذیر احمد اور راشد الخیری دونوں کو سمجھنے کے لئے اہم ہے۔

دوسری تحریر مولوی ذکاء اللہ کی وفات پر تمدن کے اگست ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، اور یہ نسبتاً زیادہ اہم ہے کہ راشد الخیری نے تو اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا جبکہ ذکاء اللہ اور نذیر احمد دونوں اختتام تک پہنچ چکے تھے۔ ایک منزل کو پہنچ بھی گیا تھا اور اب دوسرے (نذیر احمد) کو آوازے رہا تھا۔ نذیر احمد، ذکاء اللہ کے ہم مکتب رہ چکے تھے۔ ان سے زیادہ کون ان پر لکھنے کا حق رکھتا تھا:۔

پہلے راشد الخیری کا نوٹ ملاحظہ ہو:۔

"کسی ایسے رسالے کے واسطے جو اول اول میری ایڈیٹری سے شائع ہو جس کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت بھی شامل ہو، اس کے پہلے پرچے کا اس بزرگ کے کلام سے محروم رہنا جو اس وقت قوم اور ملک دونوں کے واسطے مایۂ ناز ہے، جس کے احسان سے اُردو زبان دنوں سبکدوش نہیں ہوسکتی، کم از کم میرے خیال میں نہایت شرم کی بات تھی۔ یہی تھا وہ خیال جو ۱۵ مارچ ۱۹۱۱ء کو ایک بجے کے قریب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں لے گیا۔ مولانائے موصوف اس وقت لحاف اوڑھے لیٹے تھے، میں نے اپنی آرزو ظاہر کی تو فرمایا: "میاں اب چل چلاؤ کا وقت ہے، جو کرنا تھا وہ کرلیا اور جو لکھنا تھا وہ لکھ چکے۔ شب و روز کی غذا چند چمچے دودھ کے رہ گئے ہیں۔"

اس حسن عقیدت کے اظہار پر جو مجھ کو مولانائے موصوف سے ہے، کچھ لکھوانے کا ارادہ کیا اور لکھوایا۔ مگر افسوس ضعف و نقاہت نے تکمیل نہ ہونے دی۔ امید ہے کہ آئندہ کسی پرچے میں ہدیۂ ناظرین ہو۔ بالفعل یہ چند سطریں، جو تقریب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں گو ان میں زیادہ تر میرا ذکر ہے لیکن تحریر کی وہ شان جس پر میں شاہد ہوں اس میں بھی موجود ہے۔

تمدن جب تک دنیائے ادب میں زندہ ہے ان چند سطروں پر ناز کرے گا اور میں تادم واپسیں اس مستقل مسودے کو کلیجے سے لگا کر رکھوں گا۔

راشد الخیری

اور اب نذیر احمد کو پڑھیے :-

"تقریظ یا تنقید کا لکھنا یا لکھوانا دونوں باتوں میں سے کسی کی وقعت دواؤں کے اشتہار سے زیادہ نہیں اور دونوں مذموم و متہم ہیں۔ اسی لئے میں نے گو ڈھیر ساری کتابیں لکھ ڈالیں مگر کسی سے کسی کی تقریظ یا تنقید نہیں لکھوائی بلکہ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم اور مولوی عبد الغفور شہباز مرحوم نے کسی کتاب کے چھاپنے کی مجھ سے اجازت لی اور اجازت لے کر کتاب چھپوائی اور اس کے ساتھ از خود تقریظ بھی لکھی، مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے دونوں کو تقریظ کے علحدہ کرنے پر مجبور کیا۔ اور یہ جو کسی نامی کتاب میں گورنمنٹ یا ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کا ریویو ہے، وہ ان لوگوں کا کار منصبی تھا، تقریظ و تنقید سے اس کا کیا تعلق۔ اب یہ جو کچھ میں لکھوا رہا ہوں، اس کو کوئی صاحب تقریظ یا تنقید نہ سمجھیں، بلکہ ایک طرح کی تقریب ہے کہ میرے بھتیجے اس معنی کر کہ میں انکا پھوپھا ہوں، ماہواری رسالہ تمدن نکالتے ہیں۔

مولوی عبد الراشد نے یہ شان کئی برس سے اختیار کر رکھی ہے۔ ان کی کتابیں پبلک میں کثرت سے شائع و مقبول ہوئیں۔ انھوں نے مخزن اور عصمت کو مدتوں ایڈٹ کیا اور ابھی تک رسالہ عصمت کو ایڈٹ کرتے ہیں۔ اگر کوئی مولوی عبد الراشد کے حسب نسب سے واقف ہو تو اس کو ان کے خاندانی حالات سن کر تعجب ہوگا کہ یہ خیالات انھوں نے کہاں سے اخذ کئے۔ مولوی عبد الراشد مولویوں کے خاندان کے ایک ممتاز رکن ہیں۔ جو وقت ان کی تعلیم کا تھا اس وقت تعصب مذہبی مسلمانوں میں اس بلا کا تھا کہ مولوی عبد الراشد کے موجودہ خیالات کا آدمی مسلمانوں کی سوسائٹی میں رہ نہیں سکتا تھا۔ میرے نزدیک اصلی تعلیم خاندانی سوسائٹی کی تعلیم ہے۔ جو زمانہ مولوی عبد الراشد کے تعلیم پانے کا تھا، ان کے خاندان میں مولوی عبد الراشد کے آج کے سے خیالات پیدا ہونے محال تھے، لیکن مولوی عبد الراشد میں ہم کو اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ترقی کا مادہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے۔

غرض مولوی عبد الراشد نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ انکے فطری خیال ہیں۔ ایک بات اس موقع پر لکھنے کے قابل ہے کہ مولوی عبد الراشد کے پردادا مولوی عبد الخالق مرحوم اپنے عصر میں دلی کے ممتاز مولویوں میں تھے۔ وہ آخر عمر میں بسبب ضعف پیری ایک مشت استخوان رہ گئے تھے۔ اس وقت ان کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مسجد کے ایک در میں گدڑی ڈالے بیٹھے ہیں، ایک تپائی سامنے ہے۔ اس پر کچھ کتابیں کھلی ہیں، ان کو دیکھ رہے ہیں اور کچھ ان پر لکھتے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو ان کا ترکہ یعنی کتابیں ان کی اولاد ذکور و اناث میں تقسیم ہوا۔ کچھ کتابیں مولوی عبد القادر مرحوم کے حصے میں آئیں جو مولوی عبد الراشد کے دادا اور میرے خسر تھے۔ چونکہ میں خانہ داماد تھا، مجھ کو ان کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو کوئی کتاب عربی، فارسی، اردو کی نہ تھی جس پر مولوی عبد الخالق کا حاشیہ نہ تھا، یہاں تک کہ مثنوی بدر منیر و حسن سے مولوی صاحب کی وسعت معلومات کا ثبوت کافی ملتا ہے اور اس بات کا کہ اگلے بزرگ علم کو علم کے لئے سیکھتے تھے۔ اسی طرح مولوی عبد الراشد نے جو کچھ سیکھا اپنے سے سیکھا۔ کیا ایسے شخص کا رسالہ تمدن جو وہ جاری کرنے والے ہیں تقریب کی قابلیت نہیں رکھتا؟

ہمارے خاندان میں ایک وقت وہ بھی تھا کہ میں ضلع اودنی میں بندوبست کا ڈپٹی کلکٹر تھا۔ چھٹی لے کر گھر آتا تو پہلے سے گھر میں خط لکھ بھیجتا کہ میرے پرانے کپڑے پڑے ہوں تو اسٹیشن پر بھیج دینا کہ انکو پہن کر میں ریل پر سے اتروں گا۔ یہ ہی وہ تعصب تھا جس نے مولوی عبد الراشد کو وقتی تعلیم سبقاً سبقاً حاصل نہ کرنے دی۔ مگر ان میں خداداد مادہ تھا کہ انھوں نے انگریزی بھی سیکھ لی۔ اب اس خاندان میں بے تکلف لڑکے انگریزی پڑھتے ہیں بلکہ میری نسل میں تو بعض ڈاکٹر بھی ہیں۔ ڈاکٹر بمعنی طبیب نہیں بلکہ علمی ڈاکٹر جیسا میں ہوں۔ اس نسل میں مولوی عبد الراشد کو ان کے خیالات اور انکی سیلف اسٹڈی کے لحاظ سے سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، اور وہ بھی جیسا کہ ہر شریف خاندان کے فرزند کو چاہیے مجھ کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ بس یہ چند سطریں رسالہ تمدن کی تقریب ہے جو مولوی عبد الراشد کی دوسری تصنیفات کی طرح انشاء اللہ پبلک میں مقبول ہوگا۔ میرا ذاتی حال یہ ہے کہ کئی برس سے ہاتھ مرتعش ہے اور میں خود اپنے ہاتھ سے ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتا۔ ناچار کسی سے لکھواتا ہوں تو وہ رنگ نہیں آتا۔ صرف مذہب کے متعلق کبھی کبھی کچھ لکھواتا رہتا ہوں۔ مولوی عبد الراشد نے بتقاضائے سعادتمندی مجھ سے فرمائش کی اور میں نے یہ چند سطریں لکھوا دیں۔ دستخط نذیر احمد۔ (باقی)

مراسلات

مثنوی مولانا روم کا قدیم نسخہ

ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب نے ہماری زبان (۲۲ر اپریل ۱۹۷۱ء) کے ذریعے میرے ایک مراسلے (ہماری زبان ۲۲ر مارچ) کی (مثنوی مولانا روم کے ترکی کتابخانوں کے قلمی نسخوں کے سلسلے کی) چند غلط فہمیوں کی طرف متوجہ (ازالہ) کیا ہے مگر میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب خود کئی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے ہیں۔

میں نے ترکی کے تین قدیم نسخوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں سے پہلے کے متعلق لکھا تھا کہ وہ (موزۂ آثار قدیمہ) میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "وہاں اس نام کا کوئی میوزیم نہیں۔ البتہ نسخۂ مذکور مولانا موزہ سی' میں محفوظ ہے۔" دراصل ڈاکٹر صاحب نے خواہ مخواہ موزۂ آثار قدیمہ کو اسم علم سمجھ لیا، اس کو اسم نکرہ سمجھتے تو ان کے ذہن میں الجھن نہ پیدا ہوتی۔ میری معلومات کی بنیاد ڈاکٹر نکلسن کا مولانا روم کی مثنوی جلد سوم کا انگریزی مقدمہ (ص ۱۲) ہے جہاں اس نسخے کا وجود (Qoniya Archaeological Museum) میں بتایا ہے۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے اس کا ترجمہ موزۂ آثار قدیمہ کر دیا۔ بہر حال میوزیم کے نام کے سلسلے کی اگر کوئی غلطی ہے تو اس کی ذمہ داری ڈاکٹر نکلسن کے سر ہے میرے سر نہیں۔

دوسرے نسخے کے وجود کے متعلق میں نے لکھا تھا (کتابخانۂ ظہیر آفندی)۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب خانے کے وجود سے انکار کیا ہے۔ وہ یہاں پھر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یہ کوئی عمومی کتاب خانہ نہیں تھا، شخصی کتابخانہ تھا۔ میرے بیان کا ماخذ ڈاکٹر نکلسن کا مقدمہ ہے اور موصوف کو ڈاکٹر ریتر کے ذریعے اس کی اطلاع ملی تھی۔ اکمل صاحب کو غلط فہمی اس بنا پر پیدا ہوئی کہ ان کے علم میں اس نام کا کوئی پبلک کتابخانہ نہ آسکا لیکن اس کا کوئی موقع نہ تھا کہ وہ اس نام کے شخصی کتابخانے کے وجود سے انکار کرتے۔ ان کے اس انکار سے راقم پر بددیانتی کا الزام عائد ہو سکتا ہے جس کی ذمہ داری سے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اسی بنا پر مجھے ان سے شکوۂ دوستانہ ہے۔ بہر حال میں نے تو ڈاکٹر نکلسن اور ڈاکٹر ریتر کا قول نقل کیا ہے۔ اگر ڈاکٹر اکمل صاحب کو اعتراض ہے تو ان دونوں پر اعتراض کریں، میں اس سے بری الذمہ ہوں۔

تیسرا نسخہ نافذ پاشا کے کتابخانے میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس نام کے کتابخانے سے واقف ہیں، اسی بنا پر اس سے انکار نہیں ہے البتہ نسخۂ مذکور ان کی نظر سے نہیں گذرا اس لئے میرے بیان پر انکا اعتقاد "مشکوک" ہے۔ اس نسخے کی بھی اطلاع مجھے مقدمۂ نکلسن سے ملی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اطمینان کے لئے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر نذیر احمد۔ علی گڑھ)

اُردو ٹائپ کی لاگت

میرے دیرینہ کرم فرما عبدالرزاق قریشی صاحب نے "ہماری زبان" (۱۵ر مارچ) میں ٹائپ کے سلسلے میں جو اعتراض کیا ہے اور جو مشورہ دیا ہے اسے پڑھ کر انگوٹھے چوسنے والی مثل کی صداقت کا کچھ کچھ شبہ ہونے لگا ہے۔ خیر جو بھی ہو۔

ع:۔ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست۔

انجمن ترقی اُردو نے تو طباعت کی سہولت حاصل ہوتے ہی (یعنی مسلم یونی ورسٹی پریس کے قائم ہوتے ہی) ان کتابوں کے لئے ٹائپ کو اپنانا شروع کر دیا۔ چنانچہ جذبی کی کتاب "سخن مختصر" اس کا ثبوت ہے۔ اور عجیب اتفاق کہ اس کا اشتہار بھی اسی صفحہ پر شائع ہوا جس پر قریشی صاحب کا مراسلہ۔ اب رہا راقم الحروف کی "عملی کوششوں" کا تعلق۔ اس بارے میں گذارش ہے کہ ادبی پرنٹنگ پریس اور اُردو ٹائپ فاؤنڈری نے اُردو ٹائپ کو جس مقام پر پہنچایا ہے اس کا علم خود قریشی صاحب سے زیادہ اور کسی کو نہیں!

طباعت کے خرچ کا حساب لگاتے وقت ایک بڑی اہم بات نظر انداز کر دی جاتی ہے اور وہ تعداد ہے، جس میں کتاب چھاپی جاتی ہے۔ مجھ پر پھر الزام آتا ہے کہ کاغذی حساب سے مغالطے میں ڈالتا ہوں لیکن کیا کیجیے کہ میں نے واقعی حساب لگا کر دیکھا تو قریشی صاحب کی تازہ ترین تصنیف "مظہر جان جاناں اور ان کا اُردو کلام" (ادبی پبلشرز) جس طرح چھپی ہے اس سے کتاب کی لاگت فی جلد تین روپے ہونی چاہیے لیکن یہی اگر ٹائپ میں صرف دو ہزار کی تعداد میں چھاپی جاتی تو فی جلد ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے لاگت آتی۔ میں اب بھی اس شرح سے قریشی صاحب کا آرڈر لینے کے لئے تیار ہوں پھر کیا یہ غلط ہوگا اگر میں عرض کروں۔ ع:۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

جس طرح میرے محترم دوست قریشی صاحب نے مجھ سے سوال کیا ہے کیا میں اب اُن سے پوچھ سکتا ہوں کہ انھوں نے اور ان کے ہم خیالوں نے اُردو کتابیں پڑھنے والوں کا "شوق خرید" بڑھانے کے سلسلے میں عملی طور پر کیا کوشش کی ہے؟ جب تک وہ اس شوق کو بڑھانے میں کامیاب نہ ہوں گے، ٹائپ میں سستی کتابیں چھپ سکیں گی اور اس وقت تک وہ اپنا غصہ مجھ پر اتارتے رہیں گے۔

(سید شہاب الدین دسنوی)

سلام ساگری کا کلام

سلام ساگری صاحب مطلع کرتے ہیں کہ حالیہ فتنہ و فساد میں ان کا پورا کلام ضائع ہو گیا ہے۔ جن اصحاب کو کسی رسالے یا اخبار میں یا دوسرے ذرائع سے ان کا کلام ملے تو وہ اس کی نقل یا تراشا بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔ پتہ یہ ہے:۔

(سلام ساگری۔ محلہ مچھریائی۔ ساگر۔ مدھیہ پردیش)

مثنوی سبعہ سیارہ کے متعلق

مکرمی محمد ایوب صاحب قادری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی سے مجھے لکھتے ہیں :-

"نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم نے ایک مضمون "مثنویات سودا" کے عنوان سے رسالہ ہندوستانی (اپریل ۱۹۳۲ء) میں شائع کیا ہے، بعد کو یہ مضمون مقالات شیروانی میں بھی چھپا ہے۔ شیروانی صاحب کے کتب خانہ میں نواب اعظم الدولہ کی مثنویوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں تین مثنویاں، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں اور وامق و عذرا ہیں۔ آخر الذکر ناقص ہے۔ تمہید و آغاز میں تین مثنوی: فرہاد و شیریں، شمع و پروانہ اور گل و بلبل کا بھی ذکر ہے"

یہ اطلاع میرے نہایت کارآمد ہے۔ اس لئے کہ جیسا میں نے اپنی سب سے پہلی تحریر میں عرض کیا تھا۔ میرے پاس جو کتاب "سبعہ سیارہ" ہے اس میں سب سے پہلی مثنوی (یوسف و زلیخا) ناقص ہے اور دوسری مثنوی (لیلیٰ و مجنوں) سب کی سب ضائع ہو گئی ہے۔

محمد ایوب صاحب قادری کی تحقیق و اطلاع کے مطابق نواب شیروانی مرحوم کے کتب خانہ والی کتاب میں وہ دونوں مثنویاں مکمل ہیں۔

اب ناظرین "ہماری زبان" بتائیں کہ میری رسائی اس کتاب تک کیونکر ہو سکتی ہے۔ (حامد حسن قادری۔ ناظم آباد۔ ۳ سعید ان۔ کراچی)

اقبال کا نایاب کلام

چند دن ہوئے میں مجلہ بزم سخن ۱۹۱۷-۱۸ء کا فائل دیکھ رہا تھا کہ اس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا کچھ ایسا کلام دیکھا جس کے بعض حصے ناآشنا معلوم ہوئے، بزم سخن ایک ادبی ماہنامہ تھا جو گیا سے جناب جگیشر پرشاد خلش کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، اس کے جنوری فروری ۱۹۱۷ء کے شمارے میں جو مشاعرہ نمبر ہے اقبال مرحوم کی نظم 'موج دریا' طبع ہوئی ہے جس کے تین بند ہیں یہ نظم 'بانگ درا' میں شامل ہے لیکن یہاں صرف دو ہی بند ہیں، تیسرا بند خارج کر دیا گیا ہے، آج کل کوشش ہو رہی ہے کہ اقبال مرحوم کا وہ کلام بھی جو ان کے مروجہ مجموعوں میں موجود نہیں ہے، جمع کر دیا جائے، 'سرود رفتہ' "باقیات اقبال" 'اصلاحات اقبال' اور 'تبرکات اقبال' اسی کوشش کے نتیجے میں مرتب ہوئے ہیں۔ میں نے ان مجموعوں میں بھی تیسرے بند کو تلاش کیا لیکن ان میں بھی موجود نہیں ہے، البتہ جناب بشیر الحق صاحب مؤلف 'اصلاحات اقبال' اور 'تبرکات اقبال' نے اس کو دکن ریویو (۱۹۰۹ء) سے نقل کر کے اپنے پاس رکھا ہوا ہے، اور وہ اسے اپنی تیسری تالیف میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، بند مذکور یہ ہے :-

غنچۂ آب ہیں گلشن کی تماشائی ہوں اپنی ہستی کو مٹانے کی تمنائی ہوں
کشتۂ عشق ہوں محروم شکیبائی ہوں حوصلہ دیکھو کہ میں بحر کی شیدائی ہوں

زندگی جزو کی ہے کل میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

مذکورالصدر رسالہ کے شمارہ بابت اپریل ۱۹۱۷ء میں اقبال مرحوم کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے :-

فنا ہوئے پہ بھی گویا وفا شعار ہوں میں
جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں میں

اس غزل کے چار شعر ہیں۔ 'باقیات اقبال' میں یہ غزل موجود ہے اور پانچ شعر کی ہے۔ لیکن ایک شعر جو 'بزم سخن' میں ہے وہ باقیات اقبال میں بھی موجود نہیں، نہ کسی اور مجموعہ میں ملا، جناب بشیر الحق صاحب کو بھی یہ شعر اب تک نہیں ملا تھا، شعر یہ ہے :-

نسیم صبح نہ چھیڑے مجھے گل دامن سے
کسی کے ہاتھ کا جھاڑا ہوا غبار ہوں میں

(سید حسن۔ رمنا باغ، پٹنہ)

جگر کا شعر

میں "آتش گل" کے جدید ایڈیشن کے لئے جگر صاحب کا غیر مطبوعہ کلام فراہم کر رہا ہوں۔ اگر کسی رسالے یا اخبار میں مندرجہ ذیل غزل کسی صاحب کی نظر سے گزری ہو تو مطلع فرمائیں۔ مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے۔

اب کسی شے میں دلکشی نہ رہی رہ گیا سایہ زندگی نہ رہی

لوٹ لے دولت فراق جگر
فرصت غم رہی رہی نہ رہی

(مسکین۔ محلہ بنی اسرائیل۔ میرٹھ)

سوال و جواب

(ادارۂ 'ہماری زبان' کو مختلف ادبی اور علمی مسائل پر استفسارات وصول ہوتے رہتے ہیں۔ مناسب سمجھا گیا کہ ان کا خلاصہ شائع کر کے قارئین یا پھر ادارے کی جانب سے مختصر طور پر تشفی بخش جوابات دیے جائیں ——— ادارہ)

اردو کا پہلا ڈرامہ نگار

کیا یہ صحیح ہے کہ امانت لکھنوی پہلا شخص ہے جس نے اردو میں ڈرامہ لکھا ؟ یا واجد علی شاہ کو اولیت حاصل ہے ؟

(جہاں بانو نقوی)

ایک شعر

دہلی کے ایک معروف شاعر کا شعر ہے :-

مرے ٹوٹے ہوئے پائے طلب کا مجھ پہ احسان ہے
تمہارے در سے اٹھ کر اب کہیں جایا نہیں جاتا

اس کا مفہوم کیا ہے۔ پائے طلب کہاں ٹوٹا ؟ در پر آنے سے پہلے یا در پر۔ پھر یہ کہ اب شاعر کہاں جانا چاہتا ہے ؟ ان کے در سے جانا تو شیوۂ عاشقی نہیں۔ اس کے علاوہ مصرعۂ اولیٰ میں "احسان ہے" کا ٹکڑا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر پائے طلب ٹوٹ نہ جاتا تو یہ شخص محبوب کے در پر نہ ٹھہرتا۔

(ایک سخن فہم۔ دہلی)

انجمن کا خبر نامہ

ریاستی شاخ بہار

پٹنہ مجلس عاملہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی ایک اہم نشست زیر صدارت عالی جناب محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ بتاریخ ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء کو منعقد ہوئی۔ اس بات پر غور کیا گیا کہ ساری ریاست میں ابتدائی تعلیم پر زور دیا جائے۔ پرائمری اسکول قائم کرنے اور مادری زبان اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کے سلسلے میں پوری کوشش کی جائے۔ ریاستی انجمن ایک تفصیلی اسکیم اس بارے میں تیار کر کے ایک کتابچہ شائع کرے گی اور ریاست بھر کے کارکنوں تک یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کرے گی۔ یہ بھی طے پایا کہ موجودہ ممبران مجلس عاملہ و کونسل اپنے اپنے محلہ یا شہر یا علاقے میں اس ضمن میں ایک جائزہ لے کر ابتدائی اسکول قائم کرنے کے اقدامات شروع کر دیں۔ اس کے بعد پٹنہ میں اردو گرلس ہائی اسکول کے قیام کے مسئلے پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ یکم جنوری سنہ ۱۹۶۲ء سے پٹنہ میں اسکول کھول دیا جائے اس کی تفصیلات اور دوسرے اقدامات کیلئے مسٹر محمد ایوب ایڈوکیٹ صدر انجمن کو مجاز کیا گیا۔

دوسری تجویز پر غور کرنے کے ساتھ وزیر اعلیٰ بہار سے انجمن کے وفد کے ملنے کے مسئلے پر طے پایا کہ صدر انجمن کی قیادت میں ایک وفد جلد از جلد لے جایا جائے۔ اس سلسلے میں محضر نامہ تیار کرنے اور وفد کی تشکیل نیز دیگر اقدامات کے لئے صدر انجمن کو مجاز کیا گیا۔ پرائمری تعلیم کے سلسلے میں غضنفر نواب دانش جوائنٹ سکریٹری اور شاہ مشتاق احمد ممبر مجلس عاملہ کو تمام ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ ممبران شاخ کو از سر نو تشکیل دینے کیلئے زوار حسین صاحب سے درخواست کرنا طے پایا۔ جو اپنی نگرانی میں یہ کام انجام دیں۔ محلہ درزی ٹولہ مراد پور۔ دریا پور۔ پٹنہ وارڈ آٹھ میں اردو مڈل اسکول کے قیام کے سلسلے میں فوری اقدامات کی تجویز منظور کی گئی۔ صدر گلی اردو مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی غلط بحالی سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ جلد کوئی مؤثر کارروائی کی جائے۔

شرکائے جلسہ میں حافظ شمس الدین، ڈاکٹر محمد یونس بھاگل پور، محمد عثمان غنی پھلواری، نثار احمد خاں ایڈوکیٹ، محمود عالم مختار شیر گھاٹی، محبوب احمد وارثی گیا، اظہار الحق وکیل مونگیر، پرنسپل سید عبد الحمید، محمد ادریس میونسپل کمشنر مظفر پور، غلام سرور، بیتاب صدیقی وغیرہ نے شرکت کی۔

اردو کی حق تلفی کا اعتراف

جے پور (راجستھان) میں محکمہ "بجلی اور ادن" کی جانب سے زیر اہتمام "کنا بھارت سمیتی جے پور" ایک تقریب فیسٹیول آف لنگویجز (Festival of Languages) کے نام سے ۱۴ تا ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء منائی گئی جس میں ہندی، ملیالم، گجراتی، سندھی، کشمیری، بنگالی، راجستھانی، تامل، مراٹھی، انگریزی، سنسکرت، تلگو اور پنجابی کے ڈرامے اور کھیل دکھائے گئے۔ البتہ صرف اردو کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جس کو منتظمین کی مہربانی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لہٰذا انجمن ترقی اردو راجستھان نے ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب محکمہ مذکور کو ذریعہ چٹھی متوجہ کیا کہ مذکورالصدر کئی زبانوں کے جاننے والے راجستھان میں معدودے چند ہیں۔ جبکہ اردو والوں کی تعداد یہاں لاکھوں ہے۔ پھر صرف اردو کو نظر انداز کرنا تعجب خیز ہے۔ چنانچہ موصوف نے اپنی چٹھی کے ذریعہ اس فرد گزاشت کا احساس اور اعتراف کرتے ہوئے اطمینان دلایا کہ آئندہ ایسا ہرگز نہ ہوگا اور اردو کے ڈرامے بھی اسٹیج کئے جائیں گے۔ (نامہ نگار)

مرہٹواڑے میں اردو مدارس

اورنگ آباد۔ مسٹر آر۔ بی سالوی ڈویژنل کمشنر اورنگ آباد نے مرہٹواڑے کے صحیفہ نگاروں کے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ اردو مدارس میں جہاں اشاعت کم ہے۔ اور اردو مدارس سے متعلق بعض شکایتوں کو دور کیا جانا چاہئے اور اس سلسلے میں محکمۂ تعلیمات کو فوری اقدام کے لئے کہا جائے گا ایک نمائندے کے سوال کے جواب میں ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات مسٹر شیو ہلکر نے اس بات کی پرزور تردید کی کہ مرہٹواڑے میں بعض اردو داں مدرسین ایسے بھی ہیں جنھیں مطلق مراٹھی نہیں آتی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

ودربھ میں انجمن کی شاخوں کی تجدید

ودربھ کی انجمن ترقی اردو کی وہ شاخیں جو اب محض برائے نام ہیں ۲۱ مئی سنہ ۱۹۶۱ء تک مجھے مطلع فرمائیں کہ وہ اپنے نئے انتخابات کن تاریخوں تک عمل میں لا رہی ہیں اور علاقائی انجمن سے الحاق کر رہی ہیں۔ اگر ایسی انجمنوں نے ۲۱ مئی تک اپنی انتخابی تاریخوں سے مجھے مطلع نہیں فرمایا تو انھیں قطعی طور سے معطل شاخیں تصور کر لیا جائیگا اور وہاں کے محبان اردو کو حق حاصل ہوگا کہ وہ نئے سرے سے شاخیں بنائیں۔

ودربھ میں اردو کے تعلیمی مسائل کے سلسلے میں جن محبان اردو کو حکومت مہاراشٹر کے محکمہ جات سے کسی قسم کی کوئی شکایت ہو تو علاقائی سکریٹری کو تفصیلی طور پر لکھیں۔ ازالہ کی ممکن کوشش کی جائے گی۔ (مشفق انصاری، سکریٹری ودربھ انجمن ترقی اردو)

شاہجہاں پور میں مشاعرہ

بتاریخ ۵ اپریل سنہ ۱۹۶۱ عیسوی روضہ کلب میں ایک بزم مشاعرہ زیر صدارت جناب رشید حسن خاں صاحب منعقد ہوئی جس میں باہر سے آئے ہوئے شعراء نے شرکت فرمائی۔ یہ مشاعرہ بزم ادب روضہ کی جانب سے "ریلوے ویک" کے سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ حبیب بھوپالی۔ عارف جائسی۔ آشفتہ۔ چنڈر مراد آبادی وغیرہ نے شرکت کی۔ انڈیل شاہجہانپوری۔ شیخو جائسی نے مزاحیہ کلام سنایا۔ (وہاب رشیدی۔ سکریٹری بزم)

بزم سخن (کٹک)

بزم سخن کٹک اڑیسہ کا ماہانہ مشاعرہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۱ء کو منعقد ہوا۔ صدارت جناب سید محمد اکمل نے فرمائی۔

سکریٹری کی رپورٹ کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا اور حسب ذیل شعرائے کرام نے طرحی اور غیر طرحی کلام سنا کر حاضرین جلسہ کو محظوظ فرمایا۔

رونق، خلیل تاباں، عبدالصمد واصف، ضمیر خاں ضمیر، غلام نبی بیکس، نور محمد جنوں، معشوق شہید، مجیب الرحمٰن کوثر، عبدالصمد پربھی، رحمان شاکر، عبدالجلیل خنجر، بہارالدین ریاض، امجد نجمی نے "فاتح اعظم" کے عنوان سے ایک نظم سنائی۔

یہ نظم روس کے خلائی مسافر میجر یوری گگارن پر لکھی گئی تھی۔

صدارتی تقریر کے بعد یہ نشست اختتام کو پہنچی۔

(عبدالصمد پربھی۔ سکریٹری)

شوکت لٹریری ایسوسی ایشن کرنول

۱۶ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء کو شوکت لٹریری ایسوسی ایشن کرنول کے زیر اہتمام ایک ادبی مجلس کا انعقاد عمل میں آیا۔ سید خواجہ محی الدین صاحب نے صدارت فرمائی۔

عاقل حسین نے ایک افسانہ "رات کے سائے" مشکور احمد نے ایک ہندی تنقیدی مقالہ "ساہتیہ اور زندگی"، سید خواجہ محی الدین نے اپنی انگریزی نظم "مدر مرینہ" اور خواجہ حسین نے "مذہب اور نیاز فتحپوری" ایک مضمون پڑھا۔

سلیم، سلطان محی الدین، عبدالرؤف، خضر احمد، ظاہر الحسنین، محبوب صاحب، محمد حسین، عزیز الدین خاں، عبدالحکیم اور خواجہ محی الدین نے بحث میں حصہ لیا۔ (انور کرنولی سکریٹری)

یوم اقبال

"بزم ادب" پٹنہ کالج و پٹنہ یونی ورسٹی کے زیر اہتمام مورخہ ۲۱ اپریل سنہ ۶۱ء کو شاندار طور پر یوم اقبال منایا گیا۔ اس موقع پر ایک بین الدراس مباحثہ منعقد ہوا جس کا موضوع علامہ اقبال کا ہی ایک مصرع تھا یعنی: تم مذہب ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں۔ علامہ اقبال سے متعلق مختلف دس عنوانات پر تحریری مقابلے بھی ہوئے جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے طلبہ نے حصہ لیا اور انعامات حاصل کئے۔

۲۱ اپریل سنہ ۶۱ء کو پٹنہ کالج میں علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں صوبہ اور بیرون صوبہ کے مشہور و معروف شعراء اور اہل فن حضرات نے شرکت کی۔ حفیظ بنارسی، تجمل شمسی، شمس گیاوی، کلیم عاجز، رمز عظیم آبادی، عطا کاکوی، راز عظیم آبادی، ثاقب عظیم آبادی، تمنا مظفر پوری، رضا نقوی واہی، عزیز عظیم آبادی (خیام بہار) اور ڈاکٹر اختر اورینوی قابل ذکر ہیں۔

مشاعرے کی صدارت اور تقسیم انعامات جناب سید جعفر امام صاحب وزیر قانون، اپیل و اوقاف مذہبی ریاست بہار نے فرمائی۔ موصوف نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو زبان اور اسکے جائز مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے یقین دلایا کہ حکومت بہار اس زبان کے پھولنے پھلنے میں ہر ممکن مدد کرے گی۔ معتمد بزم کی رپورٹ اور شکریے کے بعد جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ (ظہور رضوی برق)

رتن پور (ضلع بلاسپور) میں اُردو اسکول کا قیام

انجمن ترقی اُردو بلاسپور کی مہم (کہ ضلع کے اُردو اسکول کی موجودہ تعداد تین کو سو تک پہنچانا) کے سلسلے میں انجمن کے نائب صدر جناب مقصود احمد تقی اور نائب ناظم جناب سلیم بخش وکیل مورخہ ۲۳ اپریل سنہ ۶۱ء کو رتن پور (ایک تاریخی مقام) تشریف لے گئے ان کی نگرانی میں ایک جلسہ ہوا جس میں اُردو اسکول کا قیام عمل میں آیا اور مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل اُردو اسکول کمیٹی قائم ہوئی۔

محمد علی صدر، دادا میاں نائب صدر، محمد حنیف ناظم، غلام رسول نائب ناظم۔

اراکین:- محمد قاسم، پیر دین، مجید خاں۔

(ایم اے سبحان۔ ناظم انجمن ترقی اُردو بلاسپور ایم پی)

بھوپال میں پہلی "شب افسانہ"

۲۱ اپریل سنہ ۶۱ء بھوپال میں پہلی بار "شب افسانہ" منائی گئی۔ اس جلسے میں شری راج گوپال اچاری کی تامل کہانیوں کا اُردو ترجمہ کتابی صورت میں شائع کرنے پر بھوپال کے ادیب آفاق احمد کو مبارکباد پیش کی گئی۔ جلسے کی صدارت ہندی کے ادیب ظہور بخش نے کی۔ کوثر چاند پوری نے اپنی تقریر میں آفاق احمد کی خدمات کو سراہا۔ شب افسانہ میں ہندی کے مشہور لکھنے والے رمیش بخشی، ہر شنکر پرسائی، ماسوور شرد، جوشی اور اُردو کے کوثر چاند پوری، قمر جمالی اور آفاق احمد نے اپنی کہانیاں پڑھیں۔

بگدل میں "بزم ادب" کا قیام

جناب ویشنی صاحب بھوڑ گی کے زیر صدارت ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء کو جھنڈا اچنالیہ بگدل کے منعقدہ ایک جلسے میں "بزم ادب" کا قیام معرض عمل لایا گیا۔ بزم کے صدر عبدالقادر عاجز اور نائب صدر عثمان احمد تقیم چنے گئے۔ سکریٹری کے فرائض ظہیر عظمت انجام دیا کریں گے۔ ضروری انتظامی امور کے پیش نظر گیارہ اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے۔

"بزم ادب" کا پہلا اجلاس یکم مئی ۶۱ء کو ہوا۔ جس میں اُردو زبان کی فلاح و بہبودی کے اہم مسائل پر غور کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک غیر طرحی مشاعرہ بھی ہوا جس میں مقامی و بیرونی شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔

(سکریٹری "بزم ادب" بگدل ضلع بیدر)

بقیہ

امیر مینائی کے غیر مطبوعہ قصیدے کا ایک خاص قلمی نسخہ

رئیس ہو تو ایسی ہو ریاست ہو تو ایسی ہو
بڑی اقبال والی ہے بڑی نازوں کی پالی ہے
یہی گھر عید کا گھر ہے یہی در عیش کا در ہے
یہیں غم کی تباہی ہے یہیں دل کی بحالی ہے
مے عشرت کے ساغر کر رہے ہیں طوف محفل کا
خوشی نے حج ادا کرنے کی شکل اچھی نکالی ہے
عجب تو پر ہے دربار ہیں اک اک سے کہتا ہے
کہ یہ محفل تجلی گاہ حسن لایزالی ہے
فلک جھک جھک گیا ہے سنگِ در پر بوسہ دینے کو
زمیں کا رتبہ آج اللہ اکبر کتنا عالی ہے
ہلال عید سے کچھ اور ہی رونق نمایاں ہے
پتا دیتا ہے یہ اسلام کا جھنڈا ہلالی ہے
مناسب ہے کہ کروں اس وقت نذر اک مطلع رنگیں
کہیں سب دیکھ کر مطلع ہے یا پھولوں کی ڈالی ہے

مطلع

تعالی اللہ کیا پُرزور دستِ فیضِ عالی ہے
مُسلمانوں کی جس نے ڈوبتی کشتی سنبھالی ہے
تری ہمت کا کیا کہنا تری دولت کا کیا کہنا
یہ بے ماؤں کی حامی ہے یہ بیچاروں کی والی ہے
تری پامردیوں سے سربلندی اہل ایماں کو
ترے ہاتھوں سر کفار وقف پائمالی ہے
جدھر دیکھا شگفتہ ہو کے تو نے کھل گیا گلشن
نگاہِ لطف تیری خلد کے پھولوں کی ڈالی ہے
سخاوت کی مہک پھیلی ہوئی ہے سارے عالم میں
تری سرکار گلشن ہے ترا خُلق اس کا مالی ہے
کھڑا در پر صدا دیتا ہے حاتم ہاتھ پھیلائے
بھلا تیرا ہو بھر دے کاسۂ درویش خالی ہے
انھیں پاؤں سے تو نے کی ہے طے راہ خدا ترسی
انھیں ہاتھوں سے تو نے رحم کی بنیاد ڈالی ہے
دیے جاتے ہیں موتی اس طرح گویا برستے ہیں
ترے دامن کا گوشہ ہے کہ ابر برشگالی ہے

گدا ہے جو یہاں وہ بھی ہے مستِ جام استغنا
جہاں کی نعمتوں سے دل بھرا ہے ہاتھ خالی ہے
فقیروں پر نگاہ رشک پڑتی ہے امیروں کی
گلیم فقر پر لوٹا ہوا رومال شالی ہے
اشارہ تیری چشم لطف کا خالی نہیں جاتا
نظر ڈالی ہے جس پر آرزو اس کی نکالی ہے
فقیروں سے ہیں باتیں لطف کی شاہوں سے استغنا
مزاج ایسا ہی تیرا منکسر رتبہ یہ عالی ہے
کسی کو عرض حاجت کی یہاں حاجت نہیں ہوتی
کہ دل ہے آئینہ سب کے دلوں کا حال عالی ہے
شراب صاف بھر دی ہے ترے اخلاص نے دل میں
کدورت سے یہ ساغر پاک ہے تلچھٹ سے خالی ہے
اگر دن ہے تو کرتا چارہ سازی دردمندوں کی
جو شب ہے تو جناب کبریا میں زار نالی ہے
تری شان سیاست نے تری شان ریاست نے
شریروں کو سزا دی ہے فقیروں کی دعا لی ہے
تجھی پر ہے مدار اب خلق کی حاجت روائی کا
زہے قسمت کہ نازک ہاتھ پر دنیا اٹھا لی ہے
تری دریا دلی سے ہو گئے سیراب سب پیاسے
یہ دست فیض یا اک نہر قدرت نے نکالی ہے
مسلماں اب تلک بے وارثی سے مٹ گئے ہوتے
بڑھا کر ہاتھ کیا بگڑی ہوئی حالت سنبھالی ہے
کسی کی سرکشی چلتی نہیں وہ رعب ہے تیرا
نظر ڈالی ہے تو خنجر نے بھی گردن جھکا لی ہے
ہوئی ہے نور ایماں سے ترے کیا کفر کی حالت
ذرا دیکھے تو کوئی کیسی صورت کالی کالی ہے
کرے جو سیر گردوں کی رہے جو خلق کے لب پر
یہ ذکر خیر ہے تیرا وہ تیری فکر عالی ہے
خدا نے ہوشمندی کوٹ کر بھر دی ہے فطرت میں
فلاطوں کا بھی یاں غم بادہ حکمت سے خالی ہے
امیر اب تہنیت تو ہو چکی کچھ عرض مطلب کر
کمی فریاد میں کیوں ہو کہ یہ دربار عالی ہے
شہا پھر اک نگاہ لطف مجھ بیکس پہ ہو جائے
ترس کھانے کے قابل اب مری پیرانہ سالی ہے
ہوئی آساں جب مشکل تو تیری دستگیری سے
سوا تیرے مرا کوئی نہ وارث ہے نہ والی ہے
قیامت تک رہے دربار میں جشن طرب یارب
مبارک ہو تجھے دنیا میں جو عید آنے والی ہے

عرضہ ترقی خواہ تاج وسریر فدائی
امیر احمد امیر مینائی

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔